پیامِ اقبال کی عالم گیر مقبولیت

سلیم اختر

علامہ اقبال کو ہم مفکرِ مشرق اور پاکستان کا قومی شاعر کہتے ہیں ، لیکن اکثریت بالعموم اس حقیقت سے ناواقف ملتی ہے کہ علامہ اقبال محض برِصغیر پاک و ہند ہی میں مقبول نہیں بلکہ اس وقت مہذب دنیا کا شاید ہی ایسا کوئی ملک ہو جہاں علامہ اقبال کا نام معروف نہ ہو ۔ امریکہ ، یورپ اور روس میں کلامِ اقبال کے تراجم ہو چکے ہیں ۔ اسی طرح دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں ، جیسے انگریزی ، جرمنی ، فرانسیسی ، اطالوی ، روسی ، عربی ، چینی ، جاپانی ، وغیرہ میں علامہ اقبال پر کتابیں اور مقالات قلم بند کیے جا چکے ہیں ۔ علامہ اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر لاہور میں دسمبر ۱۹۷۷ میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں دنیا کے بیشتر اہم ممالک کے مندوبین نے جمع ہو کر مقالات کی صورت میں علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا ۔ چنانچہ زبان ، تہذیب و تمدن ، رنگ و نسل ، مذہب و ملت اور سیاسی نظام کے اختلافات کے باوجود امریکہ ، برطانیہ ، روس ، اٹلی ، سوڈان ، سری لنکا ، جاپان ، ایران ، سعودی عرب ، مصر ایسے ممالک کی نمائندگی کرنے والے ایک نقطہ پر متفق تھے ، اور وہ تھا عظمتِ اقبال !

سوال یہ ہے کہ علامہ اقبال کی بین الاقوامی شہرت کی کیا وجوہ ہو سکتی ہیں ۔ ایک عام تصور یہ ہے کہ علامہ اقبال پاکستان کے قومی شاعر ہیں ، تصورِ پاکستان کے خالق ہیں ۔ اس لیے ۲۱ اپریل کو یومِ اقبال سرکاری طور پر منایا جاتا تھا ۔ ہمارے سفارت خانے بھی یومِ اقبال کی تقاریب کا اہتمام کرتے ہیں جن میں ان ملکوں کے نامور دانش ور ، نقاد اور فلاسفر علامہ اقبال کے فکر و فن اور فلسفیانہ تصورات پر تقاریر کرتے اور مقالات پیش کرتے ہیں ۔ یہی نہیں ، ایران اور بعض دیگر ممالک میں تو اس موقع پر بعض اخبارات علامہ اقبال کے بارے میں خاص ایڈیشن

بھی شائع کرتے ہیں ۔ اسی طرح علمی جرائد میں بھی علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن کے بارے میں مقالات طبع ہوتے رہتے ہیں ۔ یہ سب درست ہے اور علامہ اقبال کے فکر و فن کے فروغ اور مقبولیت میں سفارت خانوں کی تقاریب نے بھی یقیناً اہم کردار ادا کیا ہے ۔

اس سلسلے میں یہ اہم نکتہ بھی پیشِ نگاہ رہے کہ کسی بھی شخصیت کو محض سفارت خانوں اور سرکاری سطح پر یوم منا کر ہی روشناسِ عام نہیں کرایا جا سکتا ۔ اگرچہ اس نوع کی تقاریب بھی مقبولیت میں خاصا اہم کردار ادا کر سکتی ہیں ، تاہم شہرت اور مقبولیت اور وہ بھی بین الاقوامی سطح پر ، تو اس کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ شخصیت کے فکری تصورات ، فلسفیانہ افکار اور شاعرانہ محاسن میں بذاتِ خود ایسی کشش ، ندرت اور جاذبیت ہو کہ ایک عالم اس کا گرویدہ ہو سکے ۔ چنانچہ آج دنیا میں جن ادیبوں ، شاعروں ، مفکروں اور فن کاروں کا ڈنکا بج رہا ہے ان سب میں ایسی ذہنی اور فکری خصوصیات ملتی ہیں کہ ہر زبان اور ملک کا فرد ان میں اپنے لیے کسی نہ کسی طرح کی کشش پاتا اور ان میں اپنے لیے سامانِ افادہ دیکھتا ہے ، اور یہی حال علامہ اقبال کا ہے ۔ اگر ان کی فن کارانہ شخصیت میں کسی طرح کی دل کشی نہ ہوتی ، اگر ان کے فلسفے میں عالم گیر کشش نہ ہوتی ، اور اگر ان کے تصورات اقوامِ عالم کے لیے باعثِ افادہ ثابت نہ ہو سکتے ، تو علامہ اقبال کبھی بھی ممدوحِ عالم نہ ہوتے ، بس میر تقی میر اور اسد اللہ خاں غالب کی مانند اُردو کے ایک بہت بڑے شاعر ہوتے ۔

علامہ اقبال نے اپنے بارے میں جب یہ کہا :

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند !۱

تو یہ محض شاعرانہ تعلی نہ تھی ، بلکہ علامہ اقبال کو واقعی اس کا احساس تھا کہ ان کے کلام میں بعض ایسی خصوصیات موجود ہیں جو دیگر ممالک کے افراد کے لیے بھی مشعلِ راہ ثابت ہو سکتی ہیں ۔ آج بین الاقوامی سطح پر علامہ اقبال کو خراجِ تحسین پیش کر کے گویا اس کی عملی طور پر توثیق کی جا رہی ہے کہ واقعی علامہ اقبال نے لاہور

۱۔ ''ضربِ کلیم'' (''کلیاتِ اقبال اُردو'') ، ص ۳۸۵/۲۲ ۔

سے تا خاکِ بخارا و سمرقند اک ولولۂ تازہ دیا ہے ۔

علامہ اقبال کی عالم گیر مقبولیت کے اسباب کا تجزیہ کرنے پر مندرجہ ذیل امور نمایاں تر نظر آئیں گے :

علامہ اقبال نے اگرچہ خطاب مسلمانوں سے کیا لیکن ان کا پیغام جغرافیائی حدود اور مذہبی عقائد کی قیود سے آزاد ہے ۔ ان کے افکار میں ایسی عالم گیر خصوصیات ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر اقوام کے افراد اور غیر مسلم بھی ان سے استفادہ کر سکتے ہیں ۔ مراکش کے پروفیسر ایس ۔ آئی ۔ فہد نے درست کہا تھا :

''اقبال ایک ہمہ گیر شخصیت ہیں ۔ آپ کی ہمدردیاں اتنی وسیع ہیں کہ ان میں تمام دنیا کے انسان بلا امتیازِ نسل و ملک سما جاتے ہیں ۔ آپ عظمتِ انسانی کے علم بردار ہیں ۔ اسی لیے اقبال کو مشرق و مغرب میں یکساں عزت حاصل ہے ۔''[۲]

علامہ اقبال کا فلسفہ عمل اور جد و جہد کا فلسفہ ہے ۔ ان کے بموجب بے حرکت و بے عمل زندگی موت کے مترادف ہے ۔ چنانچہ وہ سعی اور مسلسل سعی کا پیغام دیتے ہیں ۔ یہ عمل افراد اور اقوام دونوں کو کندن بنا دیتا ہے اور اس کے بغیر فرد اور قوم دونوں ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں ۔ یہ فلسفۂ عمل ایسا ولولہ انگیز ہے کہ حصولِ آزادی کی جد و جہد میں مصروف مسلم اور غیر مسلم بھی اسے اپنے لیے مشعلِ راہ بنا سکتے ہیں ۔ چنانچہ اقبال اب تیسری دنیا کی ان اقوام میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں جو استعماریت کے خلاف جد و جہد میں مصروف ہیں ۔

اقبال مسلمان تھے اور انھوں نے اپنے فلسفے کی اساس قرآنِ مجید کی تعلیمات پر استوار کی ، وہ متعصب مسلمان نہ تھے ۔ انھیں جہاں سے بھی روشنی ملی ، انھوں نے اسے حاصل کرنے میں تامل نہ کیا ۔ وہ بیک وقت

۲۔ [پورا مقالہ ڈاکٹر سلیم اختر کی مرتبہ ''اقبال ممدوحِ عالم'' کے صفحات ۴۵۳ تا ۴۵۹ میں شامل ہے ۔ یہ اقتباس صفحہ ۴۵۷ پر ہے ، جہاں ''یکساں (عزت حاصل ہے) ، کی جگہ ''یک جا (عزت حاصل ہے)'' درج ہے جو غلط ہے ۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے اپنے مقالے ''(۳) اقبال : ممدوحِ عالم'' (صفحات ۳۸ تا ۴۷) میں بھی یہ اقتباس موجود ہے ، جہاں ''(اقبال ایک ہمہ گیر) شخصیت'' کے بجائے ''شہری'' درج ہے ـــــ مدیر ''اقبال ریویو'']

مسلمان صوفیا ، مغربی فلاسفروں اور ہندو دانش وروں سے متاثر تھے ، جس کے نتیجے میں ان کا کلام قلبِ روشن کا آئینہ بن گیا ، ایسا آئینہ جس میں غیر مسلم اقوام بھی اپنے خد و خال کی شناخت کر سکتی ہیں ۔ مشہور انگریز نقاد اور ناول نگار ای ۔ ایم ۔ فاسٹر نے علامہ اقبال کے اسی پہلو کو سراہتے ہوئے لکھا تھا :

''اقبال کٹر مسلمان تو تھا مگر وہ کہنہ روایات کا پرستار نہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے خیالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں ، مگر وہ انتہا پسند اور متعصب نہ تھا ـــــ چنانچہ اس نے ہندوؤں اور عیسائیوں کا ہمیشہ ادب و احترام سے تذکرہ کیا ۔''

علامہ اقبال نے تمام عمر عظمتِ انسان کے گن گائے ، لیکن یہ محض جذباتی سطح پر نہ تھا ، بلکہ علامہ اقبال نے ان عوامل و محرکات کی تہ تک پہنچنے کی سعی کی جو انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑتے ہیں ۔ اس ضمن میں وہ ملک کے معاشی وسائل اور عوام کی اقتصادی صورتِ حال کی اہمیت سے بھی آگاہ تھے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اولین تالیف ''علم الاقتصاد'' (مطبوعہ ۱۹۰۳) میں ان اقتصادی امور کی نشان دہی کی جو اقوام اور افراد کو معاشی بدحالی کی دلدل میں پھنسا دیتے ہیں ۔ اس کے بعد انھوں نے ان مسائل کا فکری سطح پر مطالعہ کرکے جو نتائج اخذ کیے وہ عالم گیر اہمیت کے حامل ثابت ہوئے ہیں ۔ علامہ کے فکر کے اس پہلو سے اشتراکی ممالک میں گہری دل چسپی کا اظہار کیا گیا ۔ ان کی مشہور نظم ''لینن (خدا کے حضور میں)''[۳] دنیا کے بیشتر اشتراکی ممالک میں ترجمہ ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے ۔

یہ ہیں ان بنیادی وجوہات میں سے چند جن کی بنا پر علامہ اقبال نے عالم گیر مقبولیت حاصل کی ۔

جہاں تک اسلامی ممالک میں پیغامِ اقبال کی پذیرائی کا تعلق ہے یہ سبھی جانتے ہیں کہ علامہ اقبال نے وسیع تر قومی مفاد کی خاطر اور اپنے پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے فارسی کو ذریعۂ اظہار بنایا ۔ ۱۹۱۵ میں مثنوی ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت سے

۳۔ ''بالِ جبریل'' (''کلیاتِ اقبال اُردو'') ، ص ۱۰۶ - ۱۰۸/ ۳۹۸ - ۴۰۰ -

لے کر ۱۹۳۸ میں انتقال تک انھوں نے تواتر سے فارسی میں لکھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اشتراکِ زبان کی بنا پر علامہ برصغیر کے ساتھ ساتھ ایران میں بھی مقبولیت حاصل کر گئے اور اتنی کہ آج ایران میں بھی پاکستان کی مانند ۲۱ اپریل کو یوم اقبال منایا جاتا ہے اور اس موقع پر وہاں کے اخبارات اور علمی جراید علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر باقاعدہ خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کرتے ہیں ۔ علامہ کی ایران میں مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ تہران کے مشہور علمی مرکز ''حسینیہ ارشاد'' سے وابستہ مسجد کی چھت پر علامہ اقبال کے اشعار لکھے گئے ہیں ۔ ایران کے مشہور انقلابی دانش ور (جنھیں شاہِ ایران کے خلاف مزاحمت کے ''جرم'' میں قتل کر دیا گیا تھا) ڈاکٹر علی شریعتی نے علامہ اقبال کے حیات بخش پیغام کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انھیں ''غزالیٔ ثانی'' کا خطاب دیا تھا ۔

ایران میں اقبال شناسی کی روایت قدیم بھی ہے اور قوی بھی ۔ چنانچہ علامہ کے فارسی شعری مجموعے نہ صرف ایران میں متعدد بار شائع ہوئے ہیں بلکہ ان کے اُردو کلام کو بھی فارسی کا جامہ پہنایا جا چکا ہے ۔ علامہ اقبال کی شخصیت اور فلسفے پر متعدد ایرانی اہلِ قلم نے مفصل کتابیں قلم بند کی ہیں اور مقالات کا تو شمار ہی نہیں ۔

اگر ایران میں اقبال شناسی کی روایت کا اس کے تاریخی تسلسل میں مطالعہ کیا جائے تو اولیت ایک ایرانی استاد سید محمد علی داعی الاسلام کو حاصل ہو جاتی ہے ۔ یہ جامعۂ عثمانیہ (دکن) میں شعبۂ فارسی کے بانی اور صدر تھے ۔ انھوں نے ایرانی اہلِ قلم پر تقاریر کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا ۔ اس ضمن میں انھوں نے علامہ اقبال کی فارسی شاعری پر بھی ایک لیکچر دیا جسے بعد میں ''اقبال و شعرِ فارسی'' کے نام سے حیدر آباد دکن سے ۱۹۲۸ میں شائع کیا گیا ۔ چھیالیس صفحات پر مشتمل یہ پمفلٹ ایران میں اقبال شناسی کی بنیاد قرار پاتا ہے ۔

۱۹۴۳ میں ایران اور ہندوستان کے ادبی اور ثقافتی روابط کے فروغ کے لیے ایک انجمن قائم کی گئی ۔ اس انجمن نے ۱۹۴۴ میں پہلا یومِ اقبال منایا ۔ اگلے برس سید محمد محیط طباطبائی نے اپنے علمی مجلے ''محیط'' کا اقبال نمبر شائع کیا ، اور یوں ایران میں اقبال شناسی کی روایت کی بنیاد پائدار ہو گئی ۔

علامہ اقبال کو ایران میں مقبول بنانے میں اگرچہ کئی شعرا ،

دانش‌وروں ، نقادوں اور اہلِ قلم کا ہاتھ ہے ، لیکن اس ضمن میں سید محمد محیط طباطبائی کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں ۔ انھوں نے علامہ کی شخصیت اور پیغام کے فروغ کے لیے اپنی بہترین ذہنی صلاحیتیں وقف کر رکھی ہیں ۔ یہی نہیں ، بلکہ علامہ اقبال پر پہلا مبسوط مقالہ بھی انہی کا تحریر کردہ ہے ۔ اس کا عنوان ہے ''ترجمانِ حقیقت ، شاعرِ فارسی محمد اقبال'' ۔ یہ مقالہ تہران کے علمی مجلے ''ارمغان'' (بابت مئی ۱۹۳۸) میں طبع ہوا تھا ۔ گویا علامہ اقبال کے انتقال کے ایک ماہ بعد یہ مقالہ لکھا گیا ۔ یہ مقالہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا اور جلد ہی اہلِ دانش کو علامہ کی شاعری کے فکری محاسن کا احساس ہو گیا ۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر آج تک علامہ اقبال کے ایرانی مداحین کا حلقہ وسعت پذیر ہی نظر آتا ہے ۔

جن اہلِ قلم نے بطور اقبال شناس خصوصی نام پیدا کیا ہے ان میں سے یہ حضرات زیادہ معروف ہیں : ڈاکٹر غلام حسین یوسفی ، آقای مجتبیٰ مینوی ، ڈاکٹر احمد رجائی ، ڈاکٹر ضیاء الدین سجادی ، ڈاکٹر عبدالحسین زریں کوب ، ڈاکٹر علی شریعتی ، ڈاکٹر حسین خطیبی ، ڈاکٹر جلال متینی ، ڈاکٹر ناظر زادہ ، ڈاکٹر فریدون بدرہ ای ، ڈاکٹر محمد تقی مقتدری ، سید رضا سعیدی ، بدیع الزمان فروزان فر اور احمد احمدی پیر جندی ۔ یہ محض چند نام نہیں ، بلکہ ایران میں اقبال شناسی کی روایت میں منفرد زاویوں کی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ منظوم صورت میں علامہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے والے شعرا کا تو بلا شبہ اب شمار ممکن نہیں کہ بیشتر ایرانی شعرا نے کسی نہ کسی انداز میں علامہ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے ۔

ایران میں علامہ اقبال پر کیے گئے کام کی فکری قدر و قیمت متعین کرنے میں ڈاکٹر احمد علی رجائی کی اس رائے سے اختلافات کی گنجائش نظر نہیں آتی :

''میرے خیال میں اقبال ایک نو دریافت بر اعظم کی مانند ہیں جس میں کتنی ہی دل آویز اور قابلِ غور چیزیں ہنوز بحث طلب ہیں ۔''

علامہ کے کلام کا مطالعہ کرنے پر دو امور بطورِ خاص اجاگر ہوتے ہیں ۔ ایک تو ایران اور اہلِ ایران سے علامہ کی گہری محبت اور دوسرے زبان و اظہار کے بارے میں عجز کا اظہار !

''زبورِ عجم'' میں علامہ نے ایک غزل میں ایران کی نوجوان نسل

سے جس محبت کا اظہار کیا وہ ایک ایک شعر سے عیاں ہے - شاید اسی لیے یہ اب حوالہ کی چیز بن چکی ہے -

اس معروف غزل کے چند اشعار پیش ہیں :

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما !
غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام
تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما
مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پروین گزشت
ریختم طرحِ حرم در کافرستانِ شما !
تا سنانش تیز تر گردد فرو پیچیدمش
شعلۂ آشفتہ بود اندر بیابانِ شما
فکرِ رنگینم کند نذرِ تہی دستانِ شوق
پارۂ لعلے کہ دارم از بدخشانِ شما

* * * *

حلقہ گرد من زنید اے پیکرانِ آب و گل
آتشے در سینہ دارم از لیاقانِ شما [۴]

غزل کا ترجمہ پیش ہے :

اے عجم (ایران) کے نوجوانو ! مجھے اپنی جان اور تمہاری جان کی قسم ، میں تمہاری پہلواری میں چراغِ لالہ کی طرح جل رہا ہوں -

میرے فکر نے ضمیرِ زندگی میں کئی غوطے لگائے ، جب کہیں تمہارے افکارِ پنہاں میرے ہاتھ لگے -

میں نے مہر و ماہ کو دیکھا ، میری نظریں پروین سے بھی آگے گزر گئیں - میں نے (اپنی اس بلندیٔ فکر کے سبب) تمہارے کافرستان میں حرم کی بنیاد رکھ دی ہے -

میں نے اس شعلے کو جو تمہارے بیابان میں منتشر حالت میں تھا ، مجتمع کر دیا تاکہ اس کی لو تیز تر ہو جائے -

میری فکرِ رنگین اس لعل کے ٹکڑے کو جو مجھے تمہارے بدخشاں سے حاصل ہوا مشرق کے تہی دستوں کی نذر کر رہی ہے -

---

۴- ''زبورِ عجم'' (''کلیات'') ' ص ۱۲۵/۵۱۷ -

اے آب و گل کے پیکرو ! میرے گرد حلقہ باندھ لو ، میرے سینے میں تمھارے اسلاف کی آگ روشن ہے ۔

اسی ضمن میں مزید اشعار ملاحظہ ہوں :

تنم گلے ز خیابانِ جنتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز و نوا ز شیراز است۵

[میرا جسم جنتِ کشمیر کے چمن کا ایک پھول ہے ، جب کہ میرا دل حجاز سے وابستہ اور میری نوا کا تعلق شیراز سے ہے ۔]

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمے بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است۶

[مجھے دیکھو کہ ہندوستان میں تمھیں مجھ ایسا کوئی دوسرا نظر نہیں آئے گا کہ ہوں تو برہمن زادہ لیکن روم و تبریز کی رمز سے بھی آگاہ ہوں ۔]

عجم از نغمہ ام آتش بجان است   صدائے من درائے کاروان است
حدی را تیز تر خوانم چو عرفی   کہ رہ خوابیدہ و محمل گران است۷

[میرے نغموں نے عجم کی روح میں ایک آگ بھر دی ہے ۔ میری صدا کارواں کے لیے جرس ہے ۔ میں عرفی کی طرح حدی تیز تر گا رہا ہوں کیونکہ راستہ خوابیدہ اور محمل بوجھل ہے ۔]

اس گہری محبت کے نتیجے میں جب علامہ اقبال نے فارسی میں شاعری کی تو ہر زبان دان کی مانند انھیں اہلِ زبان کے مقابلے میں احساسِ کم تری تھا ۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا ''سبک'' کچھ اور ہے جب کہ جدید فارسی کا آہنگ کچھ اور ہے ، اسی لیے ''اسرارِ خودی'' کی تمہید میں لکھتے ہیں :

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست   بت پرستی بت گری مقصود نیست
ہندیم از پارسی بے گانہ ام   ماہِ نو باشم تہی پیمانہ ام

* * * * *

۵- ''پیامِ مشرق'' (''کلیات'') ، ص ۱۷۸/۳۴۸ ۔
۶- ''زبورِ عجم'' (''کلیات'') ، ص ۱۳/۴۰۵ ۔
۷- ''پیامِ مشرق'' (''کلیات'') ، ص ۷۲/۲۴۲ ۔

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است　　طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت　　خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت
پارسی از رفعت اندیشہ ام　　در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

[اس مثنوی سے میرا مقصد اظہارِ شاعری نہیں اور نہ کسی قسم کی بت پرستی اور بت گری ہی کا خیال ہے۔
میں ہندی ہوں اور فارسی سے نا آشنا ہوں۔ میری کیفیت ہلال کی سی ہے، یعنی خالی پیالہ ہوں۔۔۔۔
اگرچہ اُردو زبان اپنی شیرینی کے لحاظ سے شکر ہے لیکن فارسی زبان اس معاملے میں کہیں زیادہ شیرینی کی حامل ہے۔
میری فکر و تخیل اس (فارسی) کے جلوے سے مسحور ہوگئی جس کی بنا پر میرے قلم کو نخلِ طور پر شاخ کی سی عظمت ملی۔
میرے افکارِ بلند کے اظہار کے لیے فارسی زبان ہی موزوں و مناسب ہے۔]

یہ اشعار کسرِ نفسی کے طور پر سہی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کافی عرصے تک صرف زبان و اسلوب کی بنا پر ہی ایرانیوں نے علامہ اقبال کے کلام کی طرف خصوصی توجہ نہ دی ـــــ وہ توجہ جو ان کا حق بنتی تھی۔
اس ضمن میں ایک بنیادی وجہ تو برِصغیر کے فارسی گو شعرا کے بارے میں خود اہلِ ایران کا معروف رویہ ہے جس کی طرف وقتاً فوقتاً ناقدین نے اشارات بھی کیے ہیں، یعنی سوائے امیر خسرو کے وہ اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔
ایران میں مختلف شعری دبستانوں یا اسالیب کے لیے ''سبک'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ شاعری کے تین ادوار یا ''سبک'' یہ ہیں: سبکِ خراسانی، سبکِ عراقی اور سبکِ ہندی۔ برِصغیر میں سبکِ ہندی اس وقت بھی جاری رہا جب کہ ایران میں اس کے خلاف ردِ عمل شروع ہو چکا تھا جسے ''بازگشتِ ادبی'' کہتے ہیں۔ اسی لیے اہلِ ایران نے یہاں کی فارسی اور فارسی گوئی کو کبھی بھی درخورِ اعتنا نہ جانا۔
علامہ اقبال کو ان دونوں امور کا احساس تھا، اسی لیے انھوں نے خود کو متروک ''سبکِ ہندی'' کی لسانی روایت سے الگ رکھ کر اپنے لیے ایک نیا شعری اسلوب منتخب کیا۔ اس لیے جب وہ یہ کہتے ہیں:

حسنِ اندازِ بیاں از من مجو　　خوان سار و اصفہان از من مجو

تو دراصل روایتی شاعرانہ کسر نفسی سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنے لسانی موقف کی وضاحت کرتے ہیں اور وہ موقف یہ ہے :

طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است

علامہ اقبال ایران کے کلاسیکی شعرا اور بالخصوص رومی سے بے حد متاثر تھے ۔ چنانچہ انھوں نے ان کے اشعار کی تضمین اور بعض تراکیب کے استعمال سے ان کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا اور ایسے اشعار میں بھی کھل کر ان کی توصیف کی :

مطرب غزلے بیتے از مرشدِ روم آور
تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزے[۸]

• • • •

بملک جم نہ دہم مصرعِ نظیری را
''کسی کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست''[۹]

عطا کن شورِ رومی ، سوزِ خسرو عطا کن صدق و اخلاصِ سنائی[۱۰]
گہے شعرِ عراقی را بخوانم گہے جامی زند آتش بجانم[۱۱]

[اے مطرب ! مرشدِ روم (مولانا رومی) کی کوئی غزل یا شعر سنا تاکہ میری روحِ آتش تبریزی (شمس تبریز) میں غوطہ زن ہو ۔ میں نظیری کے اس مصرعے کو جمشید کی سلطنت کے عوض بھی دینے کو تیار نہیں ہوں کہ ''جو کوئی مارا نہیں گیا وہ ہمارے (یعنی عشاق کے) با وفا قبیلے سے نہیں ہے ۔''

مجھے رومی کا سا ہیجان و اضطراب ، خسرو کا سا سوز اور سنائی کا سا صدق و اخلاص عطا فرما ۔

کبھی میں عراقی کے اشعار پڑھتا ہوں تو کبھی جامی کی شاعری میری روح کو تڑپاتی ہے ۔]

علامہ اقبال کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے جبلی طور پر ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ معاصر ایرانی شعرا کے لہجے کی بھونڈی نقل اتار کر وہ

۸- ایضاً ، ص ۱۶۱/۳۳۱ - ۹- ایضاً ، ص ۱۵۹/۳۲۹ -
۱۰- ''ارمغانِ حجاز'' (''کلیات'') ، ص ۱۵/۸۹۷ -
۱۱- ایضاً ، ص ۲۸/۹۱۰ -

اپنے لیے کوئی انفرادی مقام پیدا کرنے میں ناکام رہے گے ۔ لہذا انھوں نے فارسی کے کلاسیکی شعرا اور بالخصوص رومی کے شعری آہنگ کو اپنایا ، لیکن اس میں بھی چربہ سازی نہ کی بلکہ اپنے لسانی شعور اور شعریت سے جنم لینے والی آگہی کو راہ نما بنا کو صرف اپنے انداز میں شاعری کی ۔ اس میں اگرچہ جدید فارسی کا آہنگ شامل نہ تھا لیکن اقبال نے اپنے لہجے کی شیرینی اور حلاوت سے فارسی کے تخلیقی امکانات میں بے حد اضافہ کر دیا ۔ ابتدا میں تو اہلِ زبان کو یہ اندازِ سخن قدرے نامانوس لگا اور اسی لیے شروع شروع میں ایرانی دانش وروں نے اقبال کی شعری عظمت کے اعتراف میں کافی ہچکچاہٹ کا ثبوت دیا ، لیکن جب ایک مرتبہ وہ سخنِ اقبال سے مانوس ہو گئے تو پھر ان کے ایسے شیدائی ہوئے اور ان کی انفرادیت سے ایسے مسحور ہوئے کہ اقبال کو اپنے کسی ''سبک'' میں فٹ کرنے کے برعکس انھوں نے اقبال کے اسلوب کی یکتا شیرینی اور منفرد لے کے لیے ''سبکِ اقبال'' کی اصطلاح وضع کر ڈالی ۔ چنانچہ ڈاکٹر حسین خطیبی نے ''رومیٔ عصر'' کے مقدمے میں لکھا :

''اگر خواستہ باشم سبک اشعار علامہ محمد اقبال لاہوری را در چند کلمات خلاصہ کنم ، میگویم ایں شاعر سبکے مخصوص بہ خود داشت کہ شاید مناسب باشد آنرا نام سبک اقبال میخوانم ۔''

[اگر میں علامہ محمد اقبال لاہوری کے طرزِ شاعری کو چند الفاظ میں بیان کرنا چاہوں تو یہ کہوں گا کہ اس شاعر کا اپنا خاص انداز تھا جسے مناسب الفاظ میں ''طرزِ اقبال'' کا نام دیتا ہوں ۔]

اقبال کے ایک اور ناقد داؤد شیرازی نے بھی اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے ایران میں مطبوعہ ''کلیاتِ اقبال'' کے مقدمے میں لکھا ہے :

''اقبال سبک و مکتب جدیدی در شعر فارسی تأسیس کردہ کہ حقاً باید سبک او را سبکِ اقبال نامید و قرن ادبی حاضر را باید بنام نامی او مزین ساخت ۔''

[اقبال نے فارسی شاعری میں ایک نئے طرز و دبستان کی بنیاد ڈالی جسے صحیح معنوں میں دبستانِ اقبال کا نام دیا جانا اور موجودہ ادبی صدی کو اس کے نامِ نامی سے موسوم کرنا چاہیے ۔]

اقبال کے ایک اور مداح ڈاکٹر احمد علی رجائی نے بحیثیتِ مجموعی علامہ کی زبان اور اسلوب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ اس

قابل ہیں کہ انھیں یہاں پیش کیا جائے ۔ وہ اپنے ایک مقالہ ''اقبال کا ایک شعر'' میں رقم طراز ہیں :

''اقبال کے فارسی کلام میں الفاظ ، تراکیب اور سبک کے اعتبار سے کوئی مشکل اور ابہام نظر نہیں آتا ۔ میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہوں گا کہ اقبال کا ایک کمال ان کی سادہ گوئی بھی ہے اور بڑی دل آویزی کے ساتھ وہ فلسفے کے دقیق مسائل بیان کر جاتے ہیں ۔ سادگی کا ایک اثر یہ ہے کہ بسا اوقات قاری ان کے نکات پر غور کیے بغیر گزر جاتا ہے ۔ اقبال کی یہ سادگی ان کے مرشدِ معنوی مولانا جلال الدین رومی اور ایک حد تک خواجہ شیرازی کے سبک سے مشابہ ہے ۔ رومی اور لسان الغیب حافظ نے قرآن مجید کی آیات اور احادیثِ نبوی کے استناد سے تصوف و عرفان کے بلند پایہ مسائل بیان فرمائے اور اقبال نے ان موضوعات کے علاوہ فلسفیانہ اور سیاسی افکار کو بھی اسی سادگی سے منظوم کر ڈالا ۔ وہ شاعری کی قوت سے ناقۂ بے مہار کو قطار کی طرف کھینچ رہے تھے ۔ ان کی باتیں ایسی تھیں جنھیں برملا نہیں کہا جا سکتا تھا ۔ اس لیے ہم نفسانِ خام کو سرگرمِ عمل رکھنے اور دھیرے دھیرے انھیں اپنے مقاصد سے آگاہ کرنے کی خاطر انھوں نے کنائے کی زبان اختیار کی ہے :

''سوز و گداز حالتی است ، بادہ ز من طلب کنی
پیش تو گر بیاں کنم ، مستیٔ این مقام را
لغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوے قطار می کشم ناقۂ بی زمام را !
وقت برہنہ گفتن است ، من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو کجا برم ، ہم نفسانِ خام را !''[۱۲]

اگرچہ آج علامہ اقبال ایران میں اسی طرح مقبول ہیں جیسے سعدی ، حافظ اور مولانا روم ، لیکن تاریخی لحاظ سے جائزہ لینے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے ایران کے مقابلے میں افغانستان میں پہلے شہرت حاصل کر لی تھی ، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ایران نے افغانستان کے ذریعے علامہ کی شخصیت اور فکر و فن سے تعارف حاصل کیا ۔

ایران کے مقابلے میں افغانستان میں علامہ اقبال کی مقبولیت کی وجہ

۱۲۔ ''زبورِ عجم'' (''کلیات'') ، ص ۴۴۷/۵۵ ۔

جغرافیائی قربت کے علاوہ علامہ اقبال کا دورۂ افغانستان بھی ہو سکتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں حکومتِ افغانستان کی دعوت پر علامہ اقبال، مولانا سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کابل گئے تاکہ افغانستان میں جدید تعلیم اور درس گاہوں کے قیام کے بارے میں حکومت کو مفید مشورے دے سکیں، لیکن یہ دورہ ادبی لحاظ سے بے حد دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ اس دورے میں افغانستان کے اہلِ قلم دانش وروں اور شعرا نے کثیر تعداد میں علامہ سے ملاقاتیں کیں۔ اسی زمانے میں افغانستان کے ایک شاعر محمد سرور خاں گویا نے علامہ سے خصوصی اثرات قبول کیے۔ علامہ اقبال کے کلام کو افغانستان میں متعارف کرانے کے سلسلے میں ان کی سعی خاصی اہم ہے۔ اس لحاظ سے محمد سرور خاں گویا کو افغانستان میں اقبال شناسی کی روایت کے بانیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ''ڈاکٹر اقبال (معرفی شعر فارسی)'' کے عنوان سے گویا نے علامہ اقبال پر ''کابل'' (مارچ ۱۹۳۱ء) میں جو مقالہ قلم بند کیا اسے اس بنا پر اہمیت حاصل ہے کہ علامہ پر افغانستان میں یہ پہلا مقالہ ہے۔ گویا کی زبان ہی سے سید محیط طباطبائی نے سب سے پہلے علامہ اقبال کا نام اور کلام سنا۔ افغانستان میں جو چند علمی و ادبی مجلات تھے (جن میں ''کابل'' سرِ فہرست ہے) ان میں علامہ کا کلام چھپتا رہا۔ اس ضمن میں دل چسپ بات یہ ہے کہ کافی عرصے تک اہلِ ایران علامہ کو افغانستان کا شاعر سمجھتے رہے۔

ایران اور افغانستان کے بعد جن اسلامی ممالک میں علامہ اقبال نے خصوصی شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے ان میں مصر بلا شبہ سرِ فہرست نظر آتا ہے۔ اگرچہ مصر کی زبان عربی ہے، لیکن اس کے باوجود وہاں علامہ اقبال کے بعض شعری مجموعوں کے تراجم ملتے ہیں جب کہ ان کے فلسفے کی تفہیم و تشریح کے ضمن میں مقالات قلم بند کیے جا چکے ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ عبدالوہاب عزام کی صورت میں تو بعض ایسی مقتدر شخصیات بھی ملتی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی فکرِ اقبال کی مقبولیت میں اضافے کی خاطر وقف کر رکھی تھی۔

۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال کو مصر جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں عبدالوہاب عزام کی ان سے ملاقات ہوئی۔ اگرچہ اس سے قبل وہ علامہ کے نام اور کام سے واقف ہو چکے تھے مگر اب تک ملاقات نہ ہوئی تھی۔ یہ ملاقات ایسی تھی کہ عزام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علامہ اقبال کے گرویدہ

ہو کر رہ گئے ۔ عزام نے ''پیامِ مشرق'' کا منظوم عربی ترجمہ کرکے علامہ اقبال کو پہلی مرتبہ مصر بلکہ تمام مشرقِ وسطیٰ میں متعارف کرایا ۔ اس کے بعد انھوں نے ''اسرارِ خودی'' ، ''رموزِ بے خودی'' اور ''ضربِ کلیم'' کے تراجم کیے ۔ ان باضابطہ شعری مجموعوں کے تراجم کے علاوہ انھوں نے علامہ اقبال کی کئی متفرق منظومات کے ترجمے بھی کیے ہیں ۔ آج عبدالوہاب عزام عرب دنیا میں اقبال کے سب سے اہم مترجم کی حیثیت سے معروف ہیں ۔ ان کی اقبال شناسی محض تراجم تک ہی محدود نہ تھی ، بلکہ انھوں نے علامہ اقبال کی حیات و افکار پر ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام ہے ''محمد اقبال سیرۃ و شعرہ و فلسفۃ'' ۔ عزام کو علامہ اقبال سے کتنی عقیدت تھی اور وہ کس حد تک علامہ اقبال کے شیدائی تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ پاکستان میں حکومتِ مصر کے سفیر بن کر آئے تو سفارتی ذمہ داریوں کے بوجھ کے باوجود انھوں نے اُردو سیکھنے کے لیے بھی وقت نکال لیا تاکہ علامہ اقبال کے اُردو کلام کا بھی مطالعہ کر سکیں ۔ اسی طرح انھوں نے سفارت خانے میں ایک علمی مجلس کی تشکیل کی جس کے ہفت روزہ جلسوں میں اہلِ فکر علامہ کے اشعار و افکار پر غور و فکر کرتے ۔ عبدالوہاب عزام اس مجلس کی روحِ رواں تھے ۔

عبدالوہاب عزام کے علاوہ حسن الاعظمی اور الصاوی شعلان نے بھی تراجم کے ذریعے علامہ اقبال کے کلام کو عرب دنیا میں مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے ۔ حسن الاعظمی ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال کے افکار و تصورات سے آگاہ ہو چکے تھے ۔ انھوں نے اقبال کی مشہور نظم ''ترانۂ ملی'' کا عربی میں ایسا دل کش ترجمہ کیا کہ آج بھی زبان زدِ خلق ہے ۔

حسن الاعظمی نے مشہور لاہینا شاعر الصاوی شعلان کے اشتراک سے ''فلسفۂ اقبال امیر الشعرا'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ۔ اس میں جن مشہور شخصیات کے مقالات شامل ہیں ان کے نام یہ ہیں : ڈاکٹر عبدالوہاب عزام ، محمد علی علوبہ پاشا ، سید عبدالحمید خطیب ۔ اس کتاب میں شعلان نے علامہ کی کئی معروف نظموں (جیسے ''شکوہ'' ، ''جوابِ شکوہ'') کے ترجمے بھی کیے ہیں ۔ الصاوی شعلان نے علامہ اقبال کی نظموں کے ترجموں کے علاوہ ان پر متعدد مقالات بھی قلم بند کیے ہیں ۔

ایک اور مصری دانش ور ڈاکٹر نجیب الکیلانی نے بھی علامہ اقبال کی شاعری کے انقلابی اثرات کے مطالعے پر مبنی ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ''اقبال شاعر الشائر'' (اقبال شاعرِ انقلاب) ۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی ۔ چنانچہ اب تک قاہرہ اور بیروت سے اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔

مصر کی علمی و ادبی اور تعلیمی و ثقافتی زندگی میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے جو اہم کردار ادا کیا ہے اس کی تفصیل تو ایک جداگانہ مقالے کی متقاضی ہے ، تاہم اس موقع پر اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ جدید مصر کی تعلیمی ترقی اور ادب و ثقافت میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ویسا ہی حیات بخش کردار ادا کیا جیسا برِصغیر میں سید احمد خاں نے مسلمانوں کی بیداری کے لیے کیا تھا ۔ اب یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو مسلمانوں کی ذہنی بیداری سے دل چسپی ہو اور وہ علامہ اقبال سے اثرات قبول نہ کریں ۔ چنانچہ ہم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو بھی علامہ اقبال کے حلقہ بگوشوں میں پاتے ہیں ۔ انھوں نے ''اقبال'' کے عنوان سے جو مقالہ قلم بند کیا ہے اس کے ذیلی عنوان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین علامہ کو احترام کی کس نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ ذیلی عنوان یہ ہے : ''ایک شاعر جس نے زمانے پر اپنا سکہ بٹھا دیا'' ، اور آغاز یوں کیا ہے :

''اہلِ اسلام میں دو شاعر ایسے ہو گزرے ہیں جنھوں نے اسلامی ادب کا پایہ آسمان تک پہنچا دیا ہے اور اس کی عظمت کا نقش جبینِ وقت پر ثبت کر دیا ۔ ایک ہند و پاک کا شاعر اقبال اور دوسرا دنیائے عرب کا شاعر ابوالعلاء ۔''

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس مقالے کے علاوہ بھی علامہ اقبال کے نظامِ فکر کے روشن پہلوؤں کی تشریح و تفہیم میں متعدد مقالات قلم بند کیے ہیں ۔ ان کے ساتھ ساتھ پروفیسر صالح جودت ، مشہور صحافی اور ناول نگار یوسف الصباعی اور ڈاکٹر عبدالقادر محمود کے اسما بھی قابلِ توجہ ہیں ۔

ایران اور دنیائے عرب کے بعد جس اسلامی ملک نے اقبال شناسی میں اعلیٰ معیار کی تحریریں پیش کیں ان میں ترکیہ سب سے زیادہ اہم ہے ۔ ترکیہ میں علامہ اقبال کا اولیں مداح جدید ترکی کا شاعر محمد عاکف ہے ۔ محمد عاکف نے اگر ایک طرف علامہ اقبال کو ترکیہ میں روشناس

روشناس کرانے کی سعی کی تو دوسری طرف اپنے قیامِ مصر کے دوران میں انھوں نے علامہ کو عبدالوہاب عزام سے متعارف کرا کر بالواسطہ طور پر مصر میں اقبال شناسی کی اساس استوار کی ۔

عاکف کی اولین اور پیش رو مثال کے بعد جن حضرات نے علامہ اقبال کے کلام کے تراجم کیے یا ان پر کتب و مقالات قلم بند کیے ان میں ڈاکٹر علی نہاد تارلان اور ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خاں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں ۔ ڈاکٹر تارلان نے ''اسرارِ خودی'' ، ''رموزِ بے خودی'' ، ''ضربِ کلیم'' ، ''پیامِ مشرق'' ، ''زبورِ عجم'' ، ''گلشنِ راز جدید'' کے تراجم کے علاوہ ''ارمغانِ حجاز'' کی فارسی منظومات کے بھی تراجم کیے ہیں ۔

ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خاں نے علامہ کی شخصیت اور فکر و فن پر ایک مفصل کتاب قلم بند کی ہے ۔

ان تین ممالک کے تفصیلی تذکرے کا یہ مطلب نہیں کہ صرف ان ہی ممالک میں اقبال شناسی کی روایت ملتی ہے ۔ یہ تو صرف وہ ممالک ہیں جنھوں نے اقبال شناسی میں خصوصی مقام حاصل کر لیا ہے ۔ چنانچہ اس وقت بیشتر اسلامی ممالک میں اقبال شناس دانشور ملتے ہیں ۔

اگر کسی ایک شخص کو یورپ میں اقبال شناسی کی روایت کا بانی قرار دینا ہو تو بلاشبہ یہ سہرا پروفیسر ڈاکٹر آر ۔ اے ۔ نکلسن کے سر بندھتا ہے ۔ ۱۹۱۵ میں جب علامہ نے ''اسرارِ خودی'' شائع کی تو اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر نکلسن کو پیش کیا جو اسے پڑھ کر اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرکے *The Secrets of the Self* کے نام سے شائع کیا ۔ انھوں نے علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی پر ایک مفصل مقدمہ بھی قلم بند کیا ۔ چنانچہ یہ ترجمہ اور مقدمہ یورپ میں علامہ اقبال سے اولین تعارف کا وسیلہ قرار پاتے ہیں ۔ اس ترجمے کی پذیرائی ہوئی ۔ دانشوروں نے اس پر تبصرے کیے اور مقالات قلم بند کیے ۔ ان میں ای ۔ ایم ۔ فاسٹر اور ہربرٹ ریڈ نمایاں ہیں ۔ فاسٹر انگریزی کے نام ور ناول نگار ہیں ، جب کہ ہربرٹ ریڈ نے ادبیات اور فنونِ لطیفہ کے ناقد کی حیثیت سے جو نام پیدا کیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں ''سر'' کے خطاب سے نوازا گیا تھا ۔ ڈاکٹر نکلسن کے ترجمے کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۵

تک اس کے دس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے ۔

کلامِ اقبال کو تراجم کے ذریعے مقبول بنانے والوں میں اے ۔ جے ۔ آربری نے خصوصی شہرت حاصل کی ہے ۔ وہ اب تک ''جاوید نامہ'' ، ''زبورِ عجم'' ، ''رموزِ بے خودی'' اور ''پیامِ مشرق'' میں سے ''لالہ طور'' کا ترجمہ کر چکے ہیں ، جب کہ وی ۔ جے ۔ کیرنن نے علامہ اقبال کی منتخب منظومات کا ترجمہ *Poems From Iqbal* کے نام سے کیا ہے ۔

ان تراجم کے علاوہ لاتعداد برطانوی دانش وروں اور نقادوں نے علامہ کے فلسفیانہ افکار پر مقالات قلم بند کیے ہیں ۔

برطانیہ کے بعد یورپ میں جس ملک نے اقبال شناسی میں خصوصی نام پیدا کیا وہ جرمنی ہے ۔ یہ ناممکن ہے کہ جرمنی اور اقبال کا تذکرہ ہو اور ڈاکٹر این میری شمل کا نام نہ لیا جائے ۔ ڈاکٹر شمل نے کلامِ اقبال کے فروغ کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے ۔ اسلام اور تصوف پر ان کی بہت گہری نگاہ ہے ۔ چنانچہ انھوں نے علامہ اقبال کا مطالعہ بہت ژرف نگاہی سے کیا ہے ۔ انھوں نے بیشتر اسلامی ممالک دیکھے ہیں ۔ ان کی تحریر میں علم اور مشاہدے نے گہرائی اور وسعت پیدا کر دی ہے ۔ انھوں نے علامہ اقبال پر لاتعداد مقالات کے علاوہ دو کتابیں بھی لکھی ہیں :

(۱) *Mohammad Iqbal : Poet and Philosopher* اور *Gabriel's Wing* ۔

ڈاکٹر شمل ''پیامِ مشرق'' ، ''جاوید نامہ'' اور علامہ کی بعض منظومات کے جرمن میں تراجم کر چکی ہیں ۔ ڈاکٹر شمل واحد مغربی دانش ور ہیں جنھوں نے ''جاوید نامہ'' کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا ہے ۔

جرمنی کی ڈاکٹر این میری شمل کی مانند فرانس میں بھی دو ایسی خواتین ملتی ہیں جنھوں نے علامہ اقبال کو فرانس میں مقبول بنایا ۔ ایوا میریووچ نے علامہ اقبال کی اہم ترین تالیف ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامی'' کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے ۔ اس کا دیباچہ مشہور فرانسیسی مستشرق لوئی مسینوں نے لکھا ہے ۔ ایوا ماریووچ نے ''جاوید نامہ'' اور ''پیامِ مشرق'' کا ترجمہ بھی کیا ہے ۔

ایک اور فرانسیسی خاتون لوس کاوڈ متیخ نے علامہ اقبال کے فلسفیانہ تصورات کی توضیح میں ایک کتاب لکھی ہے ۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا انگریزی اور اُردو میں بھی ترجمہ کیا جا چکا ہے ۔ انگریزی میں مُلا عبدالمجید ڈار نے *Introduction to the Thought of*

Iqbal کے نام سے ترجمہ کیا ، جب کہ اُردو ترجمہ ''فکرِ اقبال کا تعارف'' (از راقم) ہے۔

روس میں فلسفۂ اقبال کے حرکی پہلوؤں یعنی جد و جہد اور سعیٔ مسلسل کے تصورات سے خصوصی شغف کا اظہار کیا گیا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود روس کا فلسفۂ حیات بھی ان ہی تصورات سے رنگ اخذ کرتا ہے ۔ علامہ کی اس نوع کی نظموں کے بطورِ خاص روس کی مختلف زبانوں میں تراجم کیے گئے ہیں ۔ روس میں نتالیا پری گارینا نے تو اب علامہ اقبال پر اتھارٹی کی حیثیت حاصل کرلی ہے ۔ اس نے علامہ اقبال پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی ۔ وہ اب تک علامہ اقبال پر ''محمد اقبال'' اور ''محمد اقبال کی شاعری'' کے نام سے دو کتابیں لکھ چکی ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ جن روسی خواتین نے علامہ اقبال پر مقالات قلم بند کرکے خصوصی شہرت حاصل کی ہے ان میں ایل ۔ آر ۔ گورڈن پولسنکایا اور ایم ۔ ٹی ۔ ستے پن نیتس نمایاں تر ہیں ۔ ان دونوں خواتین نے ''اقبال کے سماجی نظریات'' اور ''فلسفۂ اقبال میں اخلاقیات کے مسائل'' ایسے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے ۔

ایک اور روسی دانش ور نکولے پیٹرووچ اپنی کیف نے بھی ''محمد اقبال ! ممتاز مفکر اور شاعر'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے ۔

ان کے علاوہ نکولائی گلیبوف اور ڈاکٹر الیکسی سخو چیف ، عبداللہ غفاروف اور میر شاکر وغیرہ نے بھی علامہ اقبال کے فکر و فن کو روسی عوام میں مقبول بنانے میں خاصہ اہم کردار ادا کیا ہے ۔

روس اور امریکہ میں اگرچہ نظامِ حیات اور فلسفۂ زیست کے لحاظ سے مغائرت ملتی ہے لیکن علامہ اقبال کی تحسین میں دونوں ملکوں میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ملتا ۔ ڈاکٹر لینی ایس ۔ مے نے *Iqbal : His Life and Times* کے نام سے علامہ اقبال کی شخصیت اور فلسفیانہ تصورات پر ایک مفصل کتاب لکھی ہے ۔[۱۳] اس کے علاوہ بھی متعدد نامور دانش وروں اور نقادوں نے قلم اٹھایا ہے ۔

ادھر امریکہ کے پڑوسی ملک کنیڈا میں ڈاکٹر شیلا میکڈونف نے

۱۳۔ [یہ کتاب لاہور سے شیخ محمد اشرف نے شائع کی ۔ اس وقت اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن زیرِ ترتیب ہے ـــــ مدیر ''اقبال ریویو ۔'']

علامہ اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" پر ایک زبردست مقالہ قلم بند کیا ہے۔

چیکوسلواکیہ میں میں ژاں ماریک نے بطورِ اقبال شناس خصوصی نام پیدا کیا ہے۔ انھوں نے علامہ اقبال کی منتخب منظومات کے تراجم کرنے کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال پر مقالات بھی قلم بند کیے ہیں۔ ژاں ماریک کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے علامہ اقبال کی صحیح تاریخِ پیدائش کی طرف توجہ دلائی تھی اور یہ وہی تاریخِ پیدائش (۹ نومبر ۱۸۷۷) جسے اب پاکستان میں سرکاری طور پر اپنایا گیا ہے۔

جس طرح جرمنی میں ڈاکٹر اینی میری شمل نے اقبال شناسی میں خصوصی نام پیدا کیا ہے، اسی طرح اٹلی میں پروفیسر الیساندرو بوزانی اپنی ذات میں اقبال شناسی کے ایک ادارے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ انھوں نے "گلشنِ راز جدید" اور "جاوید نامہ" کے تراجم کے ساتھ ساتھ "پیامِ مشرق"، "ضربِ کلیم"، "ارمغانِ حجاز"، "بانگِ درا" اور "زبورِ عجم" کی منتخب منظومات کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ ان تراجم کے علاوہ انھوں نے علامہ کے مختلف تصوراتِ حیات پر کئی مفصل مقالات بھی قلم بند کیے ہیں۔

اٹلی میں آرتھر جیفرے اور وتو سیلرنو نے علامہ کے فلسفے اور شاعری پر ایک ایک کتاب لکھی ہے۔

ان کے علاوہ سویڈن سے لے کر فن لینڈ تک شاید ہی کوئی ایسا یورپی ملک ہو جہاں علامہ اقبال پر تھوڑا بہت کام نہ کیا گیا ہو۔

مختلف ممالک میں اقبال شناسی کے آغاز اور ارتقا کا تقابلی جائزہ لینے پر بیشتر ممالک میں۔ خود اپنے یہاں کے روایتی مقالات کی مانند۔ زیادہ تر ابتدائی اور تعارفی قسم کی تحریریں ہی نظر آئیں گی اور تو اور فارسی کے رشتۂ اشتراک کے باوجود ایران اور افغانستان جیسے ممالک میں بھی علامہ پر زیادہ ٹھوس اور گہرائی کے حامل فلسفیانہ مقالات خاصے بعد میں نظر آتے ہیں حالانکہ فارسی کی بنا پر علامہ اقبال ان دونوں ممالک کی ادبی روایات سے پیوستہ ہی نہ تھے بلکہ انھوں نے اپنے منفرد اسلوب سے "سبکِ اقبال" کی تشکیل کی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان سب سے بھی زیادہ اہم اور قابلِ توجہ ان کے فلسفیانہ انداز اور حیات آموز تصورات انھیں جن کی بنا پر انھوں نے فارسی کی شعری کی روایات میں نہ صرف یہ کہ توسیع ہی کی بلکہ اس کا رخ بھی اپنی جانب موڑ دیا یوں کہ سنگ

نشان کے برعکس منزل قرار پائے۔

اگرچہ علامہ اقبال کو مولانا رومی سے خصوصی شغف تھا اور انھوں نے مسلم مفکرین سے بہت کچھ حاصل تھی کیا لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان کی ذہنی تربیت مغربی فلسفہ کے مختلف دبستانوں کے زیر اثر ہوئی بھی ، اگرچہ انھوں نے کانٹ ، ہیگل ، برگساں یا نطشے کے تصورات کو نہ تو آنکھیں بند کر کے قبول کیا اور نہ ہی ایک اندھے مقلد کی مانند ان کی خوشہ چینی کی ، اس لیے وہ ان پر تنقید کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے لیکن اس کے باوجود فکر اقبال پر مغربی مفکرین کے اثرات کی کلی نفی نا ممکن ہے ادھر بیشتر مسلم ممالک کی علمی سطح ہمارے جتنی بھی نہیں ہیں اپنے بارے میں کوئی خاص خوش فہمی نہیں لیکن مشرق وسطیٰ یا مشرق بعید کے بیشتر ممالک میں اعلیٰ تعلیم بالخصوص فلسفیانہ افکار کا شغف کوئی بہت اونچا معیار نہیں پیش کرتا ۔ ان حالات میں اگر اسلامی ممالک میں علامہ پر زیادہ تر تعارفی نوعیت کا کام ہوا تو یہ ایسا ہی کام ہو سکتا تھا ۔ میں اس نوع کے کام کی قدر و قیمت کم نہیں کر رہا اور نہ ہی میں اس کی اہمیت کا منکر ہوں کیونکہ ایک تو ہر ملک میں ابتدا میں اسی نوعیت کا کام ہوا ہی کرتا ہے اور دوسرے گہری فلسفیانہ بصیرت کے بغیر علامہ اقبال کا بہت گہرائی میں جا کر مطالعہ ممکن نہیں ۔ خود اپنے یہاں علامہ اقبال پر دن رات جو مقالات باندھے جا رہے ہیں ان کا مطالعہ بھی یہ رمز بلیغ اجاگر کرتا ہے ، اور تو اور خود ایران میں بھی علامہ اقبال پر جو کام ہوا تو اس کا غالب حصہ بھی تعارفی ، تشریحی یا توضیحی نوعیت کے مواد پر مشتمل تھا ہر چند کہ اس سے نہ تو اولیت کی اہمیت ختم ہوتی ہے اور نہ اقبالیات کے وسیع تر ہوتے ذخیرہ میں ان کی اہمیت پر حرف آتا ہے اسی ضمن میں بطور مثال ''علامہ اقبال'' از آقای مجتبیٰ مینوی (مترجمہ : صوفی غلام مصطفیٰ تبسم مطبوعہ : بزم اقبال لاہور) کا نام لیا جا سکتا ہے جس میں علامہ اقبال کے تصورات کا ایک اچھا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے اور بس ! فاضل مصنف ان تصورات کی تہ میں فلسفیانہ محرکات پر روشنی ڈالنے سے گریزاں نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال کے پیغام کی عالم گیر مقبولیت سے جہاں اقبال شناسی کے بین الاقوامی تناظر کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مختلف ممالک کے دانشوروں اور اقبال شناسوں نے اپنی تہذیب و تمدن اور

لسانی اور ادبی روایات کی روشنی میں جب اقبال کا مطالعہ کیا تو بالعموم ان پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جو ان کے اپنے مخصوص تصورِ زیست اور نظامِ حیات سے ہم آہنگ تھے - یہی نہیں بلکہ بعض ممالک میں تو کلامِ اقبال کے صرف اسی پہلو ہی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا گیا جس سے ان کے مخصوص فلسفہ حیات کی توثیق ہوتی تھی، بالفاظ دیگر کلام اقبال سے انھوں نے اپنے لیے ایک طرح کی سند کا کام بھی لیا ہے اس ضمن میں سویت یونین کے اقبال شناسوں کی خصوصی مثال دی جا سکتی ہے جنھوں نے علامہ اقبال کے کلام کے ان پہلوؤں کو بالخصوص زیادہ اجاگر کیا جن کی رو سے علامہ اقبال کی سوشلزم سے خصوصی دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا اس لیے وہاں کے دانش وروں اور اقبال شناسوں میں علامہ اقبال کی وہی نظمیں زیادہ مقبول ہیں جن میں روسی انقلاب اور اس کے مقاصد سے دلچسپی کا اظہار کیا گیا یا ان میں لینن اور مارکس کا تذکرہ آتا ہے چنانچہ روس کی مختلف زبانوں میں علامہ کی جن نظموں کے تراجم کیے گئے وہ بھی اس نوع کی ہیں - یہی نہیں بلکہ روس کے اقبال شناس جب بھی علامہ پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی شاعری کے ان ہی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں جن سے علامہ نے لینن اور انقلاب روس سے خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا - چنانچہ پروفیسر گیگو فسکی کے بقول :

''عظیم شاعر اور فلاسفر محمد اقبال سویت یونین میں بے حد مشہور ہیں صرف گزشتہ چند برسوں میں ان کی نظمیں روس، ازبک، تاجک، تاتاری اور دیگر زبانوں میں تیس سے زائد مرتبہ طبع ہو چکی ہیں - محمد اقبال کی زندگی، نظموں اور فلسفیانہ ورثہ پر روسی مستشرقین نے کئی کتابیں اور مقالات قلم بند کیے ہیں، اگرچہ خود محمد اقبال مادر وطن کی آزادی کا دن دیکھنے کو زندہ نہ رہے مگر ان کی تمام زندگی آزادی اور عوامی اخوت اور بھائی چارے کے مثالی تصورات کے لیے وقف رہی روسی مستشرقین نے اس امر کو بطور خاص سراہا ہے کہ اقبال نے جدید روس کے بانی لینن کو بھی اپنی ایک نظم کا موضوع بنایا تھا -''[۱۳]

پروفیسر گینگو فسکی کا یہ اقتباس روسی دانشوروں کے خصوصی رویہ

۱۳- ''Oriental College Magazine'' (Allama Muhammad Iqbal Centenary Number, 1977) p. 22.

کا مظہر ہے اور اکثریت بالعموم اسی زاویہ نگاہ سے علامہ اقبال کے فکر و فن کا جائزہ لیتی ہے۔ اگرچہ ابتدا میں روسی دانشوروں نے کسی خصوصی شغف کا اظہار نہ کیا تھا لیکن گزشتہ ربع صدی کے دوران علامہ اقبال سے روسی دانشوروں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ بعض جزئیات کی حد تک تو واقعی علامہ اقبال انہیں خود سے قریب دکھائی دیتے ہیں۔

علامہ اقبال نے جس طرح سعی مسلسل، عظمت انسان، حریت پسندی ارتقا اور تسخیر فطرت پر زور دیا ہے وہ اتنا اہم اور واضح ہے اور فکر اقبال کے نظام میں اسے اتنی اہمیت حاصل ہے کہ اب اسے بطور خاص اجاگر کرنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔ ادھر روسی دانشوروں نے بھی علامہ اقبال کے اس پہلو کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ روس میں انسان اور محنت کا اچھا خاصہ Cult بنا دیا گیا ہے چنانچہ اس لحاظ سے بھی روسی دانشور علامہ کو "اپنا" ہی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر گنگو فسکی نے بھی "عوامی اخوت اور بھائی چارے" کی بات کرتے ہوئے انہیں بطور خاص سراہا ہے۔ اگرچہ روس اور دیگر سوشلسٹ ممالک کی حد تک تو یہ درست نظر آتا ہے لیکن حقیقت تو یہ کہ انسان دوستی اور سعی و عمل کے پیغام میں ایسی آفاقیت ہے کہ اسے محض سوشلزم سے مخصوص نہیں قرار دیا جا سکتا اب یہ الگ بات ہے کہ سوشلسٹ ممالک یا اس الداز نظر کے حامی دانش وروں نے اقبال کے اس پہلو پر زور دیتے ہوئے اس سے وابستہ تصورات اور سوشلزم کے عقائد میں کچھ مشابہتیں بھی تلاش کر لیں ہیں۔

مغرب میں اقبال شناسی کے ضمن میں کی گئی کاوشوں کا تقابلی مطالعہ کرنے پر فلسفیانہ فکر کی گہرائی اور زاویہ نگاہ کے تنوع کے لحاظ سے برطانیہ، جرمنی، اٹلی اور فرانس نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان ممالک میں کیے گئے کام کے مطالعہ سے فکر اقبال کی تفہیم کے لیے ایک وسیع تر تناظر کی تلاش کا بھی احساس ہوتا ہے، برطانیہ کو تو خیر اقبال شناسی کی تحریک میں قاید کی حیثیت حاصل ہے کہ تراجم کے علاوہ ابتدائی اولیں اور تعارفی نوعیت کا وہ تمام کام انگریز مستشرقین نے سر انجام دیا جس نے نہ صرف یہ کہ مغرب کو علامہ اقبال سے روشناس کرایا بلکہ ایسا گراؤنڈ ورک بھی کیا جس کی امداد سے مزید تحقیق اور جستجو کے لیے راہیں ہموار ہوگئیں۔ چنانچہ جب پروفیسر سی ڈی کووَن (C.D. Cowan)

فخریہ اس امر کا اظہار کرتے ہیں تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے :

''ہم برطانیہ میں ، طالبیت کے احساس سے یہ بات یاد کرتے ہیں کہ سر محمد اقبال کے فکری نشو و نما کے ابتدائی اور اہم دور میں برطانوی سکالرز کو اہم کردار ادا کرنے کا موقع ملا تھا یہی نہیں بلکہ ہمیں اس پر بھی فخر ہے کہ ہمارے سکالرز نے تراجم کے ذریعہ ان کے پیغام کو عالمی سطح پر انگریزی دان طبقہ تک پہچانے میں بے حد نمایاں کردار ادا کیا ہے ۔''۱۵

اگرچہ علامہ اقبال کے انتقال کو خاصہ عرصہ بیت چکا ہے لیکن ان افکار و تصورات میں کچھ ایسی ''مستقبل بینی'' تھی کہ وہ نہ صرف ہر دور میں با معنی محسوس ہوتے ہیں بلکہ مشرق میں ان دنوں اسلام کے حوالہ سے سیاسی بیداری کے ساتھ فکری احیاء کی جو تحریکیں معرض وجود میں آ رہی ہے ہیں تو علامہ اقبال کے تصورات نہ صرف ان کی تفہیم کرتے ہیں بلکہ ان کے افکار کے تناظر میں بیداری ، احیاء اور نشاۃ الثانیہ کی یہ تحریکیں معانی کی ایک نئی جہت اختیار کر لیتی ہیں ، یوں دیکھیں تو علامہ اقبال ہر عہد کے لیے ''سمت نما'' کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اس پر مستزاد یہ کہ بدلتے حالات علامہ اقبال کی اہمیت کم کرنے کے برعکس اس میں اضافہ کا موجب بن رہے ہیں اس لیے تو فرانسس رابسن کی دانست میں :

''اقبال مشرق و مغرب کے درمیان ایک الحاقی پل کا فرض انجام دیتے ہیں اور ایسے یہ فرض ادا کرتے ہیں جب اس قسم کے پلوں کی سخت ضرورت تھی ۔ ۔ ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال زمانے کی شاہراہ پر یوں کھڑے ہیں کہ ان کا ایک قدم مشرق میں ہے تو دوسرا مغرب میں ہے ۔''

فرانسس رابسن نے اپنے مضمون کا اختتام جن سطروں پر کیا ہے وہ اس لحاظ سے بے حد معنی خیز ہیں کہ ان میں اس نے عالمی سیاست میں مسلمانوں کی موجودہ اہمیت اور اسلامی نشاۃ الثانیہ کو سامنے رکھ کر علامہ کے شاعرانہ پیغام کے بارے میں جو نتیجہ اخذ کیا وہ آج کے مغرب کے عمومی رویہ کا غماز ہے چنانچہ علامہ کے پیغام کی صراحت کے بعد اس نے مضمون کا اختتام یوں کیا :

۱۵۔ ''Oriental College Magazine'', (Jashan Namah-i-Iqbal English), 1977, p. 21.

''اقبال کا یہ پیغام ان لوگوں کے دلوں کے تار کو مرتعش کر دیتا ہے جن کے وقار کو مغرب نے مجروح کیا تھا ۔ شاید سیاسی مصلحتوں کا یہی تقاضا ہے کہ اقبال کو مشرق اور مغرب کے درمیان ایک الحاق پل تصور کیا جائے لیکن یہ کہنا بھی مناسب ہوگا کہ جوں جوں مسلمان جدید دنیا میں نئی طاقت اور نیا اعتماد حاصل کرتے جا رہے ہیں اقبال اسلام کا ذکر بڑے فخر سے کرتے ہیں اور مسلمانوں کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ بالآخر انہی کو دنیا کی امامت کا اعزاز ملے گا ۔''[۱۶]

جہاں تک فلسفیانہ تصورات میں اجتہاد اور تنوع کا تعلق ہے بلاشبہ برطانیہ پر جرمنی اور فرانس کو فوقیت حاصل ہے کہ ان دونوں ممالک نے کانٹ ، ہیگل ، نطشے اور برگساں کی صورت میں ایسے فلاسفروں کو جنم دیا جنھوں نے عالمی فکر انسانی پر بے حد گہرے اثرات چھوڑے ۔ خود علامہ بھی بعض امور میں ان سے متاثر رہے ہیں اس لیے اگر ان ممالک میں علامہ اقبال کی شاعری کے مابعد الطبیعاتی پہلوؤں سے خصوصی شغف کا اظہار کیا گیا تو یہ تعجب خیز نہ ہونا چاہیے کہ یہ ان ممالک کی فلسفیانہ روایات کے عین مطابق ہے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر مسلم ممالک کے مقابلہ میں جرمنی اور فرانس میں علامہ اقبال کے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامی'' سے نسبتاً زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا گیا اور سب جانتے ہیں کہ اقبال شناسوں کے لیے یہ خطبات بھاری پتھر ثابت ہوئے ہیں ۔ مغربی اہل قلم کو تو چھوڑئیے خود ہمارے ہاں بھی ان خطبات پر اس پایہ کا کام نہ ہو سکا جو ان خطبات کے شایان و شان ہوتا اور جس میں تحقیق اور فکر کی اس بلندی کو برقرار رکھا جا سکتا جس کا تقاضا خطبات کی بلند تر فکری سطح کرتی ہے لیکن ہم جب بھی خطبات پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا خلاصہ بیان کر دینے کے بعد سمجھتے ہیں کہ حق ادا ہوگیا حالانکہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا ! ادھر جرمن دانشوروں نے اپنی فلسفیانہ روایات کے عین مطابق خطبات سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا چنانچہ اپنی میری شمل کے بقول ''اقبال کے چھ خطبات اپنی اشاعت کی قلیل مدت کے بعد ہی جرمنی میں متعارف ہوگئے تھے ۔''[۱۷]

۱۶- ''روزنامہ امروز'' لاہور ، ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۸ء (ترجمہ : نذیر احمد خاں) ۔

۱۷- "Muhammad Iqbal and the Three Realms of the Spirit", Humburg, 1977, p. 46.

اگرچہ جرمن ناقدین اور شعراء علامہ اقبال کے اس لیے بھی مداح ہیں کہ انھوں نے گوئٹے کے دیوان مغرب کے مقابلہ میں ''پیامِ مشرق'' لکھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ علامہ کی ما بعد الطبیعات نے بھی انھیں خصوصی طور پر متاثر کیا ، چنانچہ این میری شمل سے لے کر ہرمان ہیسے (Hermann Hessey) تک سب نے علامہ کے افکار کے اس پہلو کو خصوصی طور سے سراہا - ہرمن ہیسے اپنے مشہور ناول ''سدھارتھ'' کی بنا پر برصغیر پاک و ہند کے دانش‌وروں میں خصوصی مقبولیت رکھتا ہے - اس ناول میں خود اس نے بھی سدھارتھ (گوتم کا اصل نام) کے حوالے سے زندگی کا ایک ما بعد الطبیعی تصور پیش کیا ہے - اسے مشرقیات ، روحانیات اور تصوف سے بھی خصوصی لگاؤ تھا - این میری شمل نے ''جاوید نامہ'' کے ترجمہ پر ہیسے سے پیش لفظ لکھوایا تو اس سے ہیسے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے - ہیسے نے اپنے پیش لفظ میں علامہ کے بارے میں ایسی خوبصورت بات کہی کہ وہ اب حوالہ کی چیز بن چکی ہے ، فرمان ہیسے :

''سر محمد اقبال روح کی تین مملکتوں سے متعلق ہیں چنانچہ روح کی یہی تین مملکتیں ان کے عظیم کام کا سر چشمہ ہیں - یہ ہیں : ہندوستان کی دنیا ، اسلام کی دنیا اور مغرب کا فکری سرمایہ -''[۱۸]

ادھر فرانس میں تو اقبال شناسی کا آغاز ہی خطبات (پیرس : ۱۹۵۵) کے ترجمہ از : مادام ایوا میریو وچ (Eva Meyerovitch) سے ہوتا ہے چنانچہ اس سے اقبال شناسی میں فرانسیسی دانش وروں کے رویہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ، اگرچہ فرانس میں جرمنی کے مقابلہ میں علامہ پر نسبتاً کم لکھا گیا - اسی طرح ان کی نظموں کے بھی بہت زیادہ تراجم نہیں ہوئے لیکن جو کام ہوا وہ قدر و قیمت میں کم نہیں - روسو سے لے کر سارتر تک فرانس میں نظریات اور تصورات کی پرتنوع مگر متنازعہ فیہ روایت ملتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ''حریت فکر'' کے داعی ہونے کی بنا پر علامہ

۱۸- Muhammad Iqbal and the Three Realms of the Spirit, p. 59

خود اس کتاب کا عنوان بھی ہیسے کے اس قول پر مبنی ہے - اسی طرح گزشتہ سطروں میں فرانسسی رابسن کے جس مضمون کا حوالہ دیا تھا اس میں ہیسے کا یہ اقتباس مندرج ہے -

مستزاد یہ کہ اپنے کلام میں متنوع اور بعض صورتوں میں تو متضاد تصورات ہیں ۔ جس طرح علامہ نے توازن سے نقط اعتدال پیدا کیا اسی طرح اقبال نہ صرف یہ کہ خود اس روایت کا اہم حصہ بن سکتے ہیں اس پر ان کے افکار پر نزاع فرانسیسی دانش کو بھی توازن آشنا کر سکتے ہیں ۔

اٹلی میں دانتے اور اس کے ''طربیہ خداوندی'' کو جو اہمیت حاصل ہے اسے بطور خاص واضح کرنے کی ضرورت نہیں ۔ اس لیے اگر اطالوی دانشوروں نے ''طربیہ خداوندی'' کے حوالہ سے علامہ اقبال کے ''جاوید نامہ'' کا خصوصی مطالعہ کیا تو یہ تعجب خیز نہ ہونا چاہیے بلکہ اس کے برعکس ہونا واقعی تعجب انگیز قرار پاتا ۔ ادھر اٹلی میں بھی تصوف اور روحانیت کی روایت خاصی پرانی ہے اس لیے اطالوی دانش وروں کے لیے علامہ کی شاعری اور تصورات میں دلچسپی کے کئی ساماں تھے ۔ شاید اس لیے ایساندروبوزانی کے ترجمہ شدہ ''جاوید نامہ'' کے دو ایڈیشن چھپ گئے ۔

سطور بالا میں مختلف ممالک کے حوالہ سے اقبال شناسی کے زاویوں میں جہاں تنوع اجاگر ہوتا ہے وہاں خود اقبال شناسی کی ایک بین الاقوامی روایت[۱۹] کی صورت پذیری کا بھی احساس ہوتا ہے ایسی روایت جو دن بدن وسیع سے وسیع تر اور قوی سے قوی تر ہوتی جا رہی ہے ۔ اس موقع پر یہ سوال بے محل نہ ہوگا کہ آخر کلام اقبال میں ایسی کیا خصوصیت ہے کہ اسلامی ممالک سے لے کر سوشلسٹ بلاک اور پھر مغرب کے آسودہ معاشرے سے لے کر جد و جہد میں مبتلا تیسری دنیا کے عوام تک ـــــ سبھی ''فکر اقبال'' میں کشش پاتے ہیں ۔ اور یہ بھی اس صورت میں جب کہ علامہ کے افکار کی اساس قرآن مجید پر استوار ہے اور مولانا رومی ان کے مرشد ہیں ! اب ظاہر ہے کہ مسلمانوں سے قطع نظر ، دنیا کے بیشتر ممالک کو مذہب و تمدن یا عقاید کی بنا پر ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی لیکن اس کے باوجود ہم اقبال کو ممدوح عالم پاتے ہیں، تو کیوں ؟

میرے خیال میں فلسفہ اور اعلیٰ تر شاعرانہ صلاحیتوں کے علاوہ ایک بہت بڑی بلکہ بنیادی اہمیت کی وجہ یہ بھی بنتی ہے کہ علامہ اقبال

۱۹۔ مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی مرتبہ کتابیات ''اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت'' مطبوعہ ''مجلہ تحقیق'' (نمبر ۷) اورینٹل کالج ، لاہور ۔

نے اگرچہ غلام ملک کے پسماندہ مسلم طبقہ میں جنم لیا لیکن اس کے باوجود وہ ایک بین الاقوامی مزاج رکھنے والے انسان تھے۔ ان کی دلچسپیوں کا دائرۂ عمل آفاقی تھا اور فلسفہ و علوم کا مطالعہ بھی آفاقی، اس پر مستزاد ان کا وجدان آشنا ذہن۔ دیدۂ بینا اور جامِ جم قلب! اس لیے تو ان کی شاعری الہام بن کر اور افکار مینارۂ نور میں تبدیل ہوکر کل عالم کے قلب و نظر کو روشنی بخش رہے ہیں۔ اپنی میری شمل نے اپنے مقالہ Germany and Iqbal میں مشہور جرمنی شاعر اور دانش ور رڈولف پانوذ (Rudolf Panwitz) کی عظیم شاعری کے بارے میں رائے درج کرنے کے بعد اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ''تاریخ'' کی نئی کروٹ کے لیے پانوذ نے شاعری کا جو منصب بیان کیا ہے یہ گویا اقبال کے لیے ہی لکھا گیا ہو" —— اور اسی خوبصورت اقتباس پر یہ مقالہ ختم کیا جا سکتا ہے:

تمام عظیم شاعری اپنے عصر سے وجود میں آتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ اس سے بڑھ کر ہوتی ہے کہ یہ زمانہ کی تکمیل کرتی ہے، اس کے غیر نشو و نما یافتہ افزائشی حصوں سے ناپید مواد اخذ کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ مستقبل کے دامن میں کیا ہے اور ابدیت کے لیے کیا لازم ہے۔ ایسی شاعری آئینہ عصر ہوتی ہے یہ اس کے لیے مہمیز ہے اور اسے قطع کرنے والی تیغ انصاف بھی، شاعری جامد ہونے کے برعکس متحرک تاریخ ساز پیش گوئی! . . .

عظیم شاعری معاصرین کی زنجیروں میں جکڑی روحیں آزاد کر کے انھیں اس تخلیقی عمل سے روشناس کراتی ہے جو ہر زمانہ حال سے قوی تر ثابت ہوتا ہے اور جس میں مستقبل کو جنم دینے اور پھر چھین لینے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔''[۲۰]

۲۰۔ Muhammad Iqbal and the Three Realms of the Spirit, p. 56.

"دانائے راز"

(سوانح حیات حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ)

از

سید نذیر نیازی

سید نذیر نیازی مرحوم کو ایک طویل عرصے تک حضرت علامہ اقبالؒ کا قرب حاصل رہا اور اقبالیات نصف صدی تک ان کا دل پسند موضوع مطالعہ رہا ہے۔

"دانائے راز" دو فصلوں میں ہے۔ فصل اول میں انھوں نے علامہ اقبالؒ کی ولادت سے لے کر ۱۸۹۵ء کے حالات تحریر کیے ہیں۔ دوسری فصل میں ۱۹۰۵ء تک واقعات بیان ہوئے ہیں۔

یہ کتاب حیاتِ اقبال کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے۔

صفحات : ۴۵۲ - قیمت : -/۵۶ روپے

ناشر :

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶ - میکلوڈ روڈ ، لاہور